ہندوستان اور یورپ میں نو آبادیات کا تاریخی پس منظر

سید ریاض ہمدانی*

ڈاکٹر روش ندیم**

Abstract:

This article deals with the historical situation of colonialism in sub-continent. It describes how colonialism stretched itself in a particular back ground of the colonized land. It gives a brief history of colonialism too.

یورپی و ہندوستانی تہذیبوں کے عروج وزوال کا تقابل آج کے علم وفکر کی ایک ایسی الجھن ہے جس سے ہمارا ہر صاحبِ فکر گزرتا ہے۔ یہ الجھن اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ اگر قرون وسطیٰ کے آخر تک بھی ہندوستانی تہذیب یورپ سے ترقی یافتہ تھی تو پھر ارتقا کی ایسی کون سی حرکت تھی جس سے جدید دور میں یہ توازن الٹ گیا۔ اس مقالے میں ان دونوں تہذیبوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی ارتقا کا متوازی طور پر طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے جائزہ لیا جائے گا۔

ہندوستانی تاریخ کے قدیم ادوار کے حوالے سے ہندوستان کی زرخیزی اور ''خوشحالی'' کا ذکر کرتے ہوئے ڈی ڈی کوسمبی لکھتا ہے کہ قدرتی طور پر خوراک کی فراوانی کے باعث یہاں شکار کا دور آیا ہی نہیں۔ جس نے ہلاکت خیزی یعنی اہنسا کے نظریہ کے ذریعے ہندوستانی دینیات میں انقلاب برپا کیا۔'' اسی چیز نے تشدد اور طاقت کی

---

* پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

** استاد شعبہ اُردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

ضرورت کو یورپ اور امریکہ کی بہ نسبت کم کر دیا۔''[۱] ہندوستان کی سرزمین سے ہی وادی سندھ کی عظیم تہذیب نے جنم لیا جو اپنی ہم عمر تہذیبوں میں بہت ترقی یافتہ اور متمدن تھی۔ وادی سندھ کے بحری جہاز سمیریا اور بابل تک جایا کرتے تھے۔ تین ہزار سال قبل مسیح ''جب مصر میں بڑا اہرام تعمیر کیا گیا اس وقت ہڑپا اور موئن جودڑو کا تمدن عروج پر تھا۔''[۲] ول ڈیورانٹ لکھتا ہے کہ ''چاندی، سونے، سیسے، انگ (ٹن)، جست اور لوہے کی کان کنی پندرہ سو سال قبل مسیح میں شروع ہو چکی تھی اور یورپ میں متعارف ہونے سے پہلے ہی ہند میں لوہا ڈھالنا اور رنگائی شروع ہو چکی تھی۔'' وہ مزید لکھتا ہے کہ ''کپاس کی کاشت دنیا میں سب سے پہلے ہند میں شروع ہوئی۔''[۳] رومی انہیں کے ذریعے کپاس سے متعارف ہوئے تھے۔ قدیم عہد کی یہی وہ بنیادیں تھیں جنہوں نے بعد ازاں قرون وسطیٰ میں تہذیبی عظمت کو چار چاند لگائے اور گوتم بدھ، مہابیر، چانکیہ، چندر گپت موریہ، پورس، اشوک، شنکر، تلسی داس، کالی داس، کبیر، نانک اور اکبر کے ساتھ ساتھ رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، ویدوں، ارتھ شاستر اور پنچ تنتر (کلیلہ دمنہ) جیسا حکمت افروز سرمایہ دیا اور فلسفے، اخلاقیات، مابعدالطبعیات، دیو مالا کے علاوہ کیمیا، طبیعیات، ہیئت، الجبرا، ریاضی، فلکیات، جراحت، علم نجوم، اعشاری نظام، مجسمہ سازی، ڈرامہ، رقص، شاعری اور تعمیر کے علوم وفنون پیدا کیے۔

گو یورپی تہذیب ہندوستان کی طرح قدیم اور ترقی یافتہ تو نہیں تھی لیکن یونان وروم کی عظیم فکری، سماجی، انتظامی ترقیات نے بھی ہندوستانی متذکرہ علوم وفنون اور شخصیات کی طرح انقلاب آفریں کردار ادا کیا مگر بعد کے وسطی ادوار میں ترقیات کا یہ سفر ہندوستان کے مقابلے میں اس قدر شاندار نہ رہا۔ اسی لیے جدید یورپی مفکرین قرون وسطیٰ کے یورپی جاگیرداری دور (۴۰۰ ء سے ۱۵۰۰ء) کو قرون مظلمہ یا عہدِ تاریک سے موسوم کرتے ہیں۔ یوں یہ مطالعہ اہم بن جاتا ہے جس کے تحت رومی سلطنت کے زوال اور جرمنی کے وحشی قبیلوں کی غارت گری سے پیدا شدہ حالات نے یورپ میں جاگیرداری کی بنیادیں استوار کیں۔ ان حالات میں دیہاتوں کی آبادکاری، فوجی سرداروں کے قبضے، کسانوں کا بحالت مجبوری ان کی سرپرستی میں آنا اور فوجی جاگیردار سرداروں کی مطلق العنانیت کا آغاز یورپی جاگیرداریت کے آغاز کے اہم عناصر ہیں۔ عربوں، نورز اور میگائرز نے یورپی سلطنتوں پر حملے شروع کیے تو مرکزی حکومت کمزور اور مقامی جاگیردار طاقتور ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ بادشاہ اور جاگیرداروں کو میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) کے ذریعے اپنی اپنی طاقت کی حدود قائم کرنا پڑیں۔ مرکزی حکومت کی کمزوری، مقامی جاگیردار کی مطلق العنانیت و موروثیت، دیہات اور دیہاتی بطور جاگیردار کی ملکیت، جاگیرداریت میں کلیسا کے بنیادی کردار، استحصال اور علم

دشمنی وغیرہ یورپی جاگیرداریت کے انفرادی خصائص ہیں۔ کاشت کاروں کی حیثیت جاگیرداروں کے لئے ''زندہ زرعی آلات'' کی سی تھی جن کو ہفتہ میں تین دن بیگار میں کام کرنا پڑتا۔ سڑکوں کی مرمت اور پلوں کی تعمیر کسان ہی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ لکڑیوں کی کٹائی، شکار، تنور اور چکی کے استعمال، مچھلیوں کے شکار اور مویشیوں کے چرانے کے لئے اسے جاگیردار کے ذرائع استعمال کرنے اور ٹیکس دینے کی پابندی تھی۔ کسانوں کو اپنے لڑکوں کے تعلیم پر اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ وہ'' جاگیر کے باہر کسی دوسری جگہ مالک کی منظوری کے بغیر شادی نہیں کر سکتے تھے۔ کسی سرف (قابلِ فروخت کسان) کے مرنے کے بعد اس کے جائز وارث ایک خاص ٹیکس ادا کرنے کے بعد میں اس کی ملکیت کا وارث بن سکتا تھا۔''۴؎ لیو ہیوبر مین لکھتا ہے کہ بیوہ کو شادی کے لئے اپنے مالک اعلیٰ کو ٹیکس دینا پڑتا تھا۔'' اس دور میں اگر کوئی بیوہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تو اسے شادی سے بچنے کے لیے بھی مالک اعلیٰ کو ایک رقم ادا کرنی پڑتی تھی''۵؎ ڈاکٹر مبارک علی نے لکھا ہے کہ کسی نائٹ، امیر یا فیوڈل لارڈ کے لیے کاشتکاری کرنا، ہاتھ سے کام کرنا اور محنت کرنا ممنوع تھا اور قرونِ وسطیٰ میں پڑھے لکھے لوگوں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ نچلے درجہ کے لوگ ہیں۔ ۶؎ آٹھویں صدی عیسوی سے وسطی اٹلی کے علاقے پر قبضے کے بعد کلیسا ایک خودمختار ریاست بن کر بطور سربراہِ ریاست یورپ کی سیاست میں براہ راست حصہ دار ہوگیا تھا۔ یورپ کے جاگیرداری نظام میں وہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

> کلیسا فقط روحانی طاقت نہ تھی بلکہ یورپ کا سب سے دولت مند اور سب سے بڑا جاگیردار بھی رومن کلیسا تھا۔۔۔ یہ سب زمینیں معافی کی تھیں جن پر کوئی محصول نہ تھا اور نہ حکومت ان کے معاملات میں کوئی مداخلت کر سکتی تھی۔ ۷؎

بقول ڈاکٹر مبارک علی ''چرچ (یعنی کلیسا) کو بھی فیوڈل لارڈ ز کی طرح سکہ ڈھالنے، عدالت میں فیصلے کرنے، زراعت کا انتظام سنبھالنے اور فوجی خدمات انجام دینے کے اختیارات ہوتے تھے۔''۸؎ کلیسا نے اپنی قائم کردہ مذہبی عدالتوں خاص کر انکویزیشن (INQUISTION) کے ذریعے عقل دوستی، آزادانہ سوچ، اجتہاد و معقولات اور کلیسا کے علاوہ کسی دوسری فکر کو روک رکھا تھا۔ سخت محنت، سردی کی سختی، خراب فصلوں، کھانے کی کمی، جاگیردارانہ تشدد، جبر اور استحصال کی وجہ سے معاشرہ منجمد تھا۔ گو شہروں میں گلڈ یعنی دست کاروں کی جماعتیں موجود تھیں جو حالات کی تبدیلی، نئی ایجادات اور تجارتی مقابلہ کو اپنے لیے زہرِ قاتل سمجھتی تھیں۔ کلیسا تاجروں اور دست کاروں کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ جو تھوڑی بہت تجارت شہروں میں موجود تھی وہ بھی سڑکوں کی ناگفتہ بہ حالت، ڈاکوؤں کے خوف قدم قدم پر، جاگیرداروں سے محصولات اور گلڈ کی پابندیوں، عام لوگوں کے ہاں روپے

پیسے کی کمی، ناپ تول اور کرنسی کی جگہ جگہ مختلف اقسام کے باعث بہت محدود تھی۔

ہندوستان کے حالات یورپ سے بہت مختلف تھے۔ بقول ظہیرالدین بابر'' ہندوستان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہاں ہر پیشے اور ہر حرفے کے کاریگر لاتعداد اور بے شمار ہیں۔ ہر پیشے کی اور کام کی ایک ذات ہے۔ یہ پیشے اور ہنر پشت ہا پشت سے باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے رہے ہیں۔''۹ ول ڈیورانٹ نے بھی لکھا ہے کہ'' اہل یورپ ہند کو ہر شعبے مثلاً لکڑی کے کام، صنعت کاری، سفید گری، رنگ سازی، صابن سازی، شیشہ گری، بارودسازی، آتش بازی اور چونے وغیرہ میں ماہر تصور کرتے تھے۔''۱۰

ہندوستانی زراعت کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ جب امریکہ میں مکئی دریافت ہوئی تو اس کی کاشت فوراً یہاں بھی شروع کر دی گئی۔ دریائے سندھ اور جمنا کے ذریعے نہروں کا جال بچھا دیا گیا تھا۔ لاہور، آگرہ، چٹا گانگ، خاند ندیش، بردوان اور ہگلی وغیرہ جیسے بڑے بڑے شہر علم وتہذیب کے اعلیٰ مراکز تھے۔ مواصلات کے ترقی یافتہ نظام کے تحت تمام برصغیر میں سڑکوں اور دریائی راستوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ سرائیں اور کنوئیں، جانوراوران سے چلنے والی گاڑیاں مسافروں اور مال و اسباب کی نقل وحمل کے لئے عام دستیاب تھیں۔ جن کے ذریعے صنعت اور گھریلو دستکاری کی مصنوعات یورپ وایشیا اور عرب کے مختلف ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں۔ اوڑیسہ سے بنگال تک کپڑوں کی صنعت کے ہزاروں مراکز تھے۔ ڈھاکہ کی ململ اور لاہور کے ریشمی کپڑے اور قالین کی صنعت پوری دنیا میں مانی جاتی تھی۔ سکھر، روہڑی، خیر پور، ٹھٹہ اور ملتان بھی مختلف صنعتوں کے مراکز تھے۔ اکبراعظم کے دور میں ایک سو کے لگ بھگ ہندوستانی کارخانوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ کارخانے نجی ملکیت نہیں بلکہ حکومت کے زیرانتظام ہوتے تھے جہاں توشکیں، قالین، زین، برتن، ستر پوشی، ہاتھی دانت کی مصنوعات، عطر، تیل، گھی، تصاویر، زیورات، سوتی و ریشمی کپڑا اور اسلحہ وغیرہ بنایا جاتا تھا۔ مغل سلطنت کے اختتام تک افغانستان دہلی کے ماتحت تھا اور افغانستان کے رستے بلخ، خراسان، سمرقند اور ایران سے بہت سی تجارت ہوتی تھی۔

> سندھ میں ٹھٹہ اور لاہوری بندر، گجرات میں سورت، مالا بار میں کالی کٹ اور کوچین، مشرقی ساحل پر مسولی پٹم اور بنگال میں سات گاؤں، سری پور چٹا گانگ اور سنارگارگاؤں کی بندرگاہیں مشہور تھیں۔ ان بندرگاہوں سے تجارتی سامان عرب، ایران، ترکی، عراق ودمشق اور عدن و سکندریہ کے راستے برصغیر کی برآمدات یورپ واٹلی کی بندرگاہوں تک پہنچتی تھیں۔۱۱

ول ڈیورانٹ نے ٹھیک لکھا ہے کہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ اسی تجارت سے موصول ہونے والی دولت کے ذریعے لائی گئی۔۱۲ جواہر لال نہرو نے ہندوستان اور یورپ کی تجارت کے حوالے سے لکھا ہے کہ'' روم کے مصنفوں نے اکثر

اس بات پر ماتم کیا ہے کہ سونا لد لد کر روم سے ہندوستان اور مشرقی ملکوں کو جاتا تھا اور اس کے بدلے میں مشرق والے مختلف قسم کے اسباب تعیش بھیجتے تھے۔''۱۳ دراصل ہندوستان کے ساتھ تجارت کے بدلے میں دینے کے لئے صرف اُون تھی جو یہاں کے گرم موسم کے باعث بے کار تھی۔

ہندوستان میں روزمرّہ استعمال کی چیزیں اور دیگر بنیادی ضرورتیں کبھی بھی عام آدمی کی پہنچ سے باہر نہیں رہی تھیں۔ اس ارزانی کے ساتھ ساتھ عام مزدور کو اتنی اجرت مل جاتی تھی کہ وہ تنگ دستی کا شکار نہ ہو۔ اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مبشر حسن لکھتے ہیں:

> ایک روپیہ میں چالیس دام ہوتے تھے اور مزدور کی یومیہ اجرت دو تین دام ہوتی تھی۔ ایک مزدور آدھے دام میں صبح وشام کی روٹی کھا سکتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں سب سے ''نکمے'' غلام کو ایک دام یومیہ ملتا تھا۔ ماہر کاریگر کو تین سوا تین روپے ماہوار ملتے تھے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے ''کرخنداروں'' کو سترھویں صدی کے شروع میں دو روپے ماہوار ملتے تھے۔۱۴

جب کہ ول ڈیورانٹ کے بقول:

> اکبر کے عہد میں دستکاروں کو تین سونوسینٹ روزانہ معاوضہ ملتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں قیمتیں خاصی ارزاں تھیں۔ ۱۶۰۰ء میں ایک روپے کی مالیت ۳۲.۵ سینٹ تھی جس سے ۱۹۶۸ پاؤنڈ گندم یا ۲۷۸ پاؤنڈ جو خریدا جا سکتا تھا۔۔۔ سترھویں صدی میں ہند آنے والے ایک اور انگریز کا روزانہ کا اوسط خرچ صرف چار سینٹ تک محدود تھا۔۱۵

ہندوستان کی مرکزی حکومت بالعموم استحکام، طاقت اور انتظام کے حوالے سے بہت شاندار رہی۔ برصغیر کو انتظامی طور پر ایک مرکز کے تحت متحد رکھنے کے لئے حکومتی کاموں کی تقسیم بہت زیادہ درجہ وار تھی۔ اکبر کے دور کی انتظامی مشینری میں منصب داروں کے تینتیس (۳۳) درجے تھے۔ منصب داری کی طرح بادشاہ اور اعلیٰ عدالتیں نہ تو ذاتی ملکیت کا حق کسی کو دیتیں اور نہ ہی امراء کے عہدوں کو موروثی حیثیت دیتی تھیں۔ زمین نجی نہیں بلکہ خدا کی ملکیت اور ''الاٹ شدہ'' مانی جاتی تھی جو قابلیت کی بنا پر بادشاہ کی طرف سے کبھی بھی کسی کو بھی دی جا سکتی تھی۔ بقول سبط حسن: ''منصب داروں اور جاگیرداروں کو زمین پر حق ملکیت حاصل نہ تھا بلکہ ملک کی ساری زمین ریاست کی ملکیت تھی۔۔۔ بادشاہ سلامت کسی منصب دار سے خوش ہوئے تو لاہور، اودھ یا ملتان کی جاگیر عنایت کر دی، ناراض ہوئے تو بنگال بھیج دیا یا گوالیار کے قلعہ میں قید کر لیا۔''۱۶ کسی امیر یا زمیندار کو سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لئے فوجی طاقت کا استعمال بھی کیا جاتا تھا۔ یوں زرعی اراضی کا نظام موروثی نہ ہونے کے باعث یہاں کے منتظم اتنے طاقتور تھے ہی نہیں کہ یورپی جاگیرداروں کی طرح بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کر سکتے۔ زمین گاؤں کی مشترکہ ملکیت

تھی۔ بادشاہ کا کسی کو زمین دینا دراصل اس سے ریاست کے لئے ایک مقررہ لگان وصول کرنا تھا۔ امراء زمینوں کے بدلاؤ کی وجہ سے اپنا اثر ورسوخ ایک علاقے میں قائم نہیں کر سکتے تھے۔ دیہاتوں کی آزاد، مستحکم اور خود مختار حیثیت کی وجہ لوگ خوش حال زندگی گزارتے تھے۔ کارل مارکس کی طرح ڈی ڈی کوسمبی نے بھی ہندوستانی دیہات کو ''لازمان'' اور وقت سے آزاد نظر آنے والا، بیرونی دنیا سے تقریباً منقطع اور خود منقسم قرار دیا ہے جس میں پیشہ ورذاتوں کی تقسیم کو ''قرون وسطی کی پیشہ ورانہ برادری (GUILD) کا ہندوستانی قائم مقام'' کہا ہے۔ ۱۷ بقول سبط حسن: ''مملکت کے امور میں دیہات کے باشندوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا اس وجہ سے ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ دہلی کے تخت پر کون بیٹھا اور کون معزول ہوا۔ بشرطیکہ ان کے گاؤں کی چھوٹی سی دنیا پر اس تبدیلی کا کوئی اثر نہ پڑے۔'' ۱۸ جواہر لال نہرو کے مطابق دیہات کی سالانہ منتخب کردہ پنچائیت کے آئینی اور انتظامی اختیارات وسیع ہوتے تھے جو زمینوں کی تقسیم اور لگان کی وصولی بھی کرتی تھی۔ کئی کئی پنچائتوں پر نگرانی کے لیے ایک بڑی پنچائیت ہوتی تھی۔ عورتیں بھی ان پنچائتوں کی ممبر ہوتی تھیں۔

> دیہات کی یہ پنچائتیں اپنی آزادی کی بڑے اہتمام کے ساتھ حفاظت کرتی تھیں۔ یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ کوئی سپاہی دیہات میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس شاہی اجازت نامہ نہ ہو۔۔۔ (جبکہ) ہر بڑے شہر میں بہت سے کاریگر اور سوداگر ہوتے تھے اور دستکاروں کی انجمنیں ہوتی تھیں۔ تجارتی انجمنیں اور ساہوکار کارپوریشن قائم تھے یہ سب اپنے اندرونی انتظامات خود ہی کرتے تھے۔ ۱۹

یعنی گاؤں کے لوگ حکومت کو لگان کی ادائیگی کے بعد معاملات میں خود مختار تھے۔ نئے حملہ آوروں کی فتوحات کے نتیجے میں بھی ہندوستان کی یہ معاشی اور سماجی تنظیم بدستور برقرار رہی۔ دیہات کی اس خود مختاری کا زوال بندوبست دوامی کے تحت بعد از اں انگریز کے یورپی موروثی جاگیرداریت کے پھیلاؤ سے ہوا۔ لیکن یہ دیہی خود مختاریت بعد کے ادوار میں ریاستی انتظام کا حصہ بننے لگی۔

> ۔۔۔علاؤالدین خلجی (۱۳۱۶ء۔۱۲۹۶ء) نے جو زرعی اصلاحات کیں ان کے ذریعے گاؤں سے چودھری، مقدم اور خوط کی تمام آمدن کو لے لیا۔ اس نے حکومت کا پچاس فیصد حصہ مقرر کیا جو اتنا زیادہ تھا کہ اس کی ادائیگی کے بعد ان کے پاس بقدر ضرورت ہی بچتا تھا۔ دراصل علاؤالدین ان کی طاقت کو کمزور کر کے اپنے خلاف یورپ کے جاگیرداروں جیسی بغاوت کے اندیشے کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ شیر شاہ سوری (۱۴۸۶ء۔۱۵۴۵ء) نے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور مقدم اور چودھری جو اب تک صرف گاؤں کی پنچائیت کے سامنے ہی جوابدہ تھے انہیں سرکاری ملازم کی حیثیت دے کر حکومت کے سامنے جوابدہ کر لیا اس طرح ان کی خود مختار حیثیت کو ختم کر دیا۔ اکبر اعظم

(۱۵۵۶ء۔۱۶۰۵ء) نے ان تمام انقلابی کارروائیوں کو ایک نظام کی شکل دے دی۔ جس سے حکومت اور کسانوں کے درمیان براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ [۲۰]

دیہات کی کمزور ہوتی یہ خودمختاریت مرکزی انتظامیہ کے ریاستی ڈھانچے سے منسلک ہو کر ارتقا پذیر ہندوستانی قومی نظام کی مضبوطی کا باعث بنی۔

یورپ میں بارھویں تیرھویں صدی کی صلیبی جنگوں میں فوجی ضروریات کی فراہمی کے لئے تاجر طبقہ وجود میں آیا۔ اٹلی کی شہری ریاستوں وینس اور جنیوا میں تو کچھ نہ کچھ بڑی تجارت پہلے سے موجود تھی۔ یہاں مسلم اقتدار کے دوران شمالی افریقہ کے مسلمانوں سے تجارتی معاہدات و تعلقات کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ کئی تجارتی مقامات بحیرہ روم کے کناروں پر قائم تھے۔ لہذا صلیبی جنگوں میں زیادہ تجارتی منافع کما کر اٹلی کے تاجروں نے خود کو مستحکم و منظّم کیا اور تجارتی توسیع کے لئے جہاز سازی کی طرف بھی توجہ کی۔ برفیلے اور سرد یورپ کو گوشت محفوظ رکھنے کے لئے مسالوں، سوتی کپڑوں اور امراء کو سامانِ تعیش، چینی کے برتن، شیشے کا سامان، سلک، ساٹن، ہیرے جواہرات، زیورات، قالین اور عطریات کی ضرورت تھی۔ مشرق کے ساتھ تجارت میں بہت زیادہ نفع تھا اسی نے یورپ کے تجارتی سرمایہ دار کو پیدا کیا تھا۔ یوں شہروں میں تجارتی میلے بڑھے اور امن عامہ، تحفظ اور تجارتی مرکزیت کا تصور ابھرا۔ تجارتی طبقہ قدیم پابندیاں توڑنے اور شہروں میں زمین کی فروخت، عدالتی نظام اور محصولات کے نئے نظام کا خواہش مند بنا۔ کسان بغاوتیں سامنے آئیں۔ زمین بھی تجارتی جنس بنی اور کسان ایک غلام سے آزاد مزدور بن گیا۔ زمین اور کسان کے وراثتی و ملکیتی حق سے محرومی، آپس کی خانہ جنگیوں اور نئے درمیانے طبقے یعنی تاجروں سے جاگیردار کمزور ہوا۔ بادشاہ کا انحصار تاجر طبقے پر بڑھا تو پندرھویں صدی میں پہلی بار بادشاہ نے قومی سطح پر محصولات کا طریقہ رائج کر کے تنخواہ دار ملازم رکھے۔ انہی دنوں مارٹن لوتھر جیسے مصلحین نے سماجی تبدیلی اور مساوات پر مبنی اصلاحِ مذہب کی تحریکیں شروع کیں۔ ۱۴۶۵ء میں جرمنی میں چھاپہ خانہ کی ایجاد نے علم پر سے کلیسا کی اجارہ داری توڑ کر اسے عام کر دیا۔

> اس نئی تجارت یعنی ابھرتے ہوئے متوسط (تجارتی) طبقے نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اس کی مزید ترقی کی راہ میں قدیم فرسودہ جاگیرداری نظام حارج ہے اور کلیسا قدیم جاگیرداری نظام کا مضبوط قلعہ ہے۔ اس لیے جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے لئے اس کلیسائی قلعہ کو ڈھانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس وقت ایسا ہی ہوا۔ اس کشاکش نے مذہبی لبادہ پہن رکھا تھا اور یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ مذہب کی یہ نئی تحریک ''پروٹسٹنٹ ریفرمیشن'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ درحقیقت یہ پہلی نتیجہ خیز لڑائی تھی جس نے ایک طرف پاپائے روم کے اقتدارِ اعلیٰ کو ختم کیا اور دوسری طرف ابھرتے ہوئے

متوسط طبقے کوفرسودہ جاگیرداری نظام پر حاوی کیا۔۲۱

سولہویں صدی یورپ کی ترقی کے آغاز کا دور ہے۔اس دور کی ایجادات اور سائنسی معلومات نے غیر محفوظ اور بے شمار محصولات والی مہنگی برّی تجارت کے مقابلے میں سمندری سفر کو ترقی دی۔تجارتی منافع کمانے اور لوٹ مار کرنے کے شوق میں واسکوڈے گاما اور کولمبس نے امریکہ،افریقہ اور ایشیا کے ساحل اور نئی دنیائیں دریافت کیں۔تاجروں نے دستکاری مراکز قائم کیے اور ٹھیکے یا دہاڑی پر کاریگروں سے کام کروانا شروع کر دیا۔انگلستان میں اونی کپڑے اور لوہے کی دست کاریوں میں کافی ترقی ہوئی۔دوسرے ملکوں سے فوجی لوٹ مار،ٹیکس،خراج،تاوان،سستی خرید اور غلاموں کی تجارت وغیرہ نے سرمائے کو کئی گنا کر دیا جس سے سودی کاروبار کے پھیلاؤ کے لیے بینکنگ سسٹم قائم ہوا۔نئی ضرورتوں کے تحت جاگیردار اور پادری بھی تجارت میں حصہ لینے لگے۔بدلتے ہوئے معاشی نظام کے باعث مذہبی نظریاتی ڈھانچے میں تبدیلیاں ناگزیر تھیں کیوں کہ معاشی قوت اب کلیسا سے تجارتی سرمایہ داروں کی طرف منتقل ہوگئی تھی۔پرانے مذہبی عقائد نئی معاشی قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔مبشر حسن لکھتے ہیں:

> سولہویں اور سترہویں صدی میں یورپ کی طاقتیں نہ صرف برصغیر میں پاؤں جمانے کی کوشش کر رہی تھیں بلکہ پورے افریقہ،ایشیاء اور امریکہ میں اڈے اور آبادیاں قائم کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔۔۔یورپ کے چھوٹے بڑے شہروں میں دستکاروں کے بہت سے مراکز قائم ہو چکے تھے۔جاگیرداری اور زمینداری نظام بستر مرگ پر تھا۔۲۲

ادھر ہندوستان میں پندرھویں اور سولہویں صدی میں معاشرتی سطح پر سماجی اونچ نیچ اور ذات پات کے خلاف شہری دست کار ہنرمندوں کی بھگتی تحریک کا آغاز ہوا جس میں کاریگر،جولاہے،درزی،موچی،حجام اور بھنگی وغیرہ جیسے کاریگر شامل تھے۔اس کا مقصد مذہب و نسل سے بالاتر ہو کر ایک وسیع تر فکری نظام کے ذریعے نئے ہندوستانی نظام کو تقویت دینا تھا جس کے اثرات ہندوستان کی سیاسی،سماجی اور معاشی سطح پر بہت دوررس ہوئے۔اکبراعظم اور اس کے قومی سطح پر سیاسی،معاشی،مذہبی،تعلیمی اور فکری اقدامات انہی اثرات کی پیداوار تھے۔شیر شاہ سوری جیسے اعلیٰ منتظم کی بنائی ہوئی سڑکیں،سرائیں اور محفوظ راستے تجارت کے مزید فروغ میں معاون ثابت ہوئے اور تجارتی سامان ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچنے لگا جس سے صنعت و حرفت کی ترقی ہوئی۔منڈیوں میں مال کی مانگ بڑھی تو پیداوار میں اضافہ ہوا جس نے غیر ملکی تجارت کی ترقی میں مزید اہم کردار ادا کیا۔حکومت نے تاجروں کی سرپرستی کی۔شاہی خاندان اور امراء نے تجارت میں سرمایہ کاری کرنے کے ساتھ ساتھ تاجروں کی حوصلہ افزائی کی۔حکومت نے تجارت کے فروغ کے لیے باقاعدہ محکمہ قائم کیا جو منڈی میں قیمتوں کا تعین کرتا تھا۔اکبراعظم نے پورے ملک میں ایک کرنسی کو نافذ کر کے تجارت کو مزید فروغ دیا۔ہندی/اردو لینگوا فرانکا کا قیام اور جاٹوں،مرہٹو،

روہیلوں اور سکھوں کی تحریکوں کی صورت میں قومیت پرست اور جمہوری قوتوں کا ابھار ایک وسیع تر سماجی وسیاسی معیشت کے مستحکم نظام کا اظہار تھا۔ ہندوستان کے تاجر کاریگروں سے سامان تیار کرواتے اور اس کو ملکی و غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرتے۔ یوں حکومتی سرپرستی، بھگتی رواداری، نئے شہروں کے قیام، سڑکوں اور سراؤں کی تعمیر، امن وامان اور حفاظتی انتظامات کی وجہ سے ہندوستان کا تاجر اپنے ملک میں ''تجارتی سرمایہ'' پیدا کر رہا تھا۔ یہ ''تجارتی سرمایہ'' اور مال ہندوستان کے دستکاروں، کاریگروں اور صنعتکاروں کے لئے بہت معاون تھا۔ اس لئے ہندوستان کی صنعت (خصوصاً کپڑے کی) انتہائی ترقی یافتہ تھی۔ یوں ہندوستان ''کنٹرولڈ جاگیرداریت'' سے ''تجارتی سرمایہ'' کے متحرک مرحلے میں رواں دواں تھا۔ اسی ''تجارتی سرمایہ'' نے ''صنعتی سرمایہ'' کے معاشی نظام کی طرف ارتقاء پذیر ہونا تھا۔ یہاں جو معاشی تبدیلیاں آرہی تھیں اور اس میں جو صلاحیتیں پنہاں تھیں وہ اس تبدیلی کے عمل کو تیز تر کر رہی تھیں۔ ہندوستان کا تاجر طبقہ دراصل متذکرہ سیاسی وسماجی ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آیا تھا جو کہ خوش حالی اور ترقی یافتہ معاشرے کی علامت تھا۔ فیروز آباد، حصار، فتح آباد، فیروز پور، جونپور، بدایوں اور پٹنہ جیسے نئے نئے آباد ہونے والے شہر اس بات کا روشن ثبوت ہیں۔ یہی وجہ کہ جاگیرداری عہد کا ہندوستان اپنی ہم عصر تہذیبوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور فعال تھا۔ یہاں کا معاشرہ منجمد اور ٹھہرا ہوا نہیں تھا بلکہ زرعی دور کی عہد بہ عہد تبدیلیوں اور تقاضوں کو پورا کرتا ہوا آگے بڑھنے والا معاشرہ تھا۔ ہندوستان کی زرعی، صنعتی اور معدنی دولت کے حوالے سے بالکل ٹھیک لکھا گیا ہے کہ اس کی ''اسی شہرت نے شمال مغربی دروں سے آریاؤں، ایرانیوں، ہنو، سیتھیوں، ترکوں اور تاتاریوں اور سمندری راستے سے ولندیزیوں، پرتگیزیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کو فوج کشی کی ترغیب دی تھی۔'' ۲۳ؔ

یورپ کی تجارتی رفتار سے بڑھنے سے وینس اور جنیوا کے بعد پرتگال، سپین، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس بھی تجارتی مراکز بن گئے۔ انہوں نے ہندوستان، چین، جاپان، وسطی امریکہ کے میکسیکو اور جنوبی امریکہ کے علاوہ شمالی امریکہ اور افریقہ تک اپنی پہنچ مکمل کر لی۔ یہ فتوحات ان پیشہ ور مہم جو کمپنیوں کے ذریعے سے کی گئیں جن کا کہنا تھا کہ ''حوصلہ مند تاجروں کی جماعت ان ملکوں، سلطنتوں، جزیروں اور مقامات کی تلاش کے لئے قائم کی جارہی ہے جن تک تاجروں کی ابھی رسائی نہیں ہوئی ہے۔'' ۲۴ؔ اس تجارتی انقلاب نے سائنسی ایجادات، نئی دریافتوں، جدید علوم، ادب اور آرٹ کو ترقی دی۔ دنیا کے چار براعظموں کے درمیان ہونے والی اس تجارتی سرمایہ کاری کے لئے ایک نئے سرمایہ داری ادارے ''جوائنٹ سٹاک کمپنی'' نے جنم لیا۔ جس کے حصص کو نفع ونقصان کی بنیاد پر عوام میں فروخت کیا جاتا تھا۔ ان کمپنیوں کو حکومت کی آشیرباد اور قانونی طور پر اجارہ داریاں حاصل تھیں۔ ''ان

کمپنیوں میں سے سات کمپنیاں تو 'ایسٹ انڈیا' کمپنیوں کے نام کی تھیں۔ یہ انگلستان، ہولینڈ، فرانس، سویڈن اور ڈنمارک میں قائم ہوئیں۔'' ۲۵ اسی دور میں سپین، ہندوستان کی تلاش میں میکسیکو اور پیرو میں سونے چاندی کی کانوں سے ۱۵۴۵ء سے ۱۶۰۰ء تک چھ لاکھ ہزار کلوگرام سے زائد چاندی لوٹ لایا جس نے پورے یورپ کی معیشت بدل دیا۔ ان تبدیلیوں نے جاگیرداروں کو اندر ہی اندر کھوکھلا بھی کر دیا۔ بے روزگاری کے باعث کسانوں نے شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا جہاں نیا ابھرتا ہوا تجارتی سرمایہ دار ان کا منتظر تھا۔ سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی ہندوستان کی طرح دست کار صنعت یعنی مینوفیکٹریوں پر مشتمل یورپی تجارتی سرمائے کا دور تھا۔ یورپی اقوام نے سرمائے اور دولت کے حصول کے لیے افریقہ اور امریکہ جیسے کمزور قبائلی ملکوں میں نسل کشی کر کے مفادات پورے کئے لیکن ہندوستان جیسے مضبوط اور طاقتور حکومتوں سے پہلے پہل صرف تجارتی مراعات مانگیں۔ اس وقت تک تجارتی معاشی توازن ہندوستان کے حق میں ہی تھا۔ یہاں معاشی فتوحات کے لیے یورپ کی تمام اقوام کے درمیان دوڑ لگ گئی۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی مصنوعات کے خلاف ارزاں ہونے کی وجہ سے انگلستان میں احتجاج بلند ہوا کیوں کہ اس دور میں جن دست کار فیکٹریوں نے کام شروع کیا وہ ہندوستانی مال کے باعث سخت نقصان اٹھا رہے تھے۔

> یہ احتجاج دراصل ۱۶۹۶ء میں شروع ہوا تھا جب انگلستان کے دستکاروں نے ہندوستان اور چینی مصنوعات کی درآمد کے خلاف بلوے کئے تھے۔ احتجاج کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تا آنکہ ۱۷۰۰ء میں ایشیا سے ریشمی کپڑے اور پھولدار سوتی کپڑے کی درآمد پر پابندی عائد کر دی گئی۔۔۔ تاہم تجارتی مقابلہ پھر بھی جاری رہا۔ بنگال اور سورت کا تجارتی کپڑا اتنا سستا ہوتا تھا کہ انگلستان کے جولاہے مقامی مارکیٹ میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں پھر احتجاج ہوا جس کے پیش نظر حکومت نے پہلے تو ہندوستانی کپڑے کی درآمد پر ڈیوٹی لگائی اور پھر ۱۷۲۰ء میں ہندوستانی کپڑا پہننا قانونی طور پر جرم قرار دیا۔ ۲۶

بعدازاں انگلستان سب سے پہلے اپنے ہاں کے جاگیردارانہ نظام کو مٹانے اور ہندستانی دست کار صنعت تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لہذا اس نے اپنی نئی قوتوں کے ذریعے ہندوستان میں پرتگالی، فرانسیسی، ولندیزی، ہسپانوی اقوام کو شکست دے کر نوآبادیات قائم کرنے کے لیے راہیں صاف کر لیں جس سے ہندستان کی تاریخ کا پانسہ پلٹ گیا اور پاک و ہند ایک طویل نوآبادیاتی غلامی کے شکنجے میں جکڑا گیا۔ ایڈورڈ سعید مائیکل ڈوائل کے حوالے سے کہتا ہے کہ ''ایمپائر ایک رسمی یا غیر رسمی تعلق ہے جس میں کوئی ریاست اور سیاسی معاشرے کی موثر سیاسی حاکمیت کو کنٹرول کرتی ہے۔ اسے طاقت، سیاسی گٹھ جوڑ، اقتصادی، سماجی یا ثقافتی انحصاریت کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سامراجیت محض کسی ایمپائر کو قائم کرنے یا برقرار رکھنے کا عمل یا پالیسی ہے۔'' ۲۷

نوآبادیات کا یہ شکنجہ آج بھی جاری ہے۔اسی لیے ایڈورڈ سعید کے بقول:

> ''ہمارے دور میں بلاواسطہ نوآبادیت تقریباً ختم ہوگئی ہے سامراجیت جس جگہ موجود تھی اب بھی وہیں جاری ہے اور یہ سیاسی، آئیڈیالوجیکل، اقتصادی اور سماجی دساتیر کے ساتھ ساتھ عمومی ثقافتی حلقے میں بھی موجود ہے۔۔۔(آزادیوں کے بعد بھی) اس دور کی واضح ایک شناخت ہونے کے باوجود سامراجی ماضی کا مفہوم مکمل طور پر اس کے اندر نہیں تھا بلکہ کروڑوں لوگوں کی حقیقت میں سرایت کر گیا تھا جہاں اس کی زبردست قوت آج بھی بااثر ہے۔'' ۲۸

فرانز فینن نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ'' نوآبادیت اور سامراجیت نے اپنے پرچم نگوں کر کے اور ہمارے علاقوں سے اپنے پولیس دستے واپس بلا کر سارا مسئلہ حل نہیں کر دیا۔'' ۲۹

آج برصغیر پاک و ہند کا شعر و ادب، تاریخ، ثقافت، سماجی سیاسی صورت حال نوآبادیاتی اور پس نوآبادیات منظر نامے کی اس تفہیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اسی لیے اردو دنیا میں اس حوالے سے تحقیق کے نئے رجحانات ابھرتے ہوئے جدید شعور کا حصہ بن رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈی ڈی ،کوسمبی ’’قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب۔تاریخی پس منظر میں‘‘فیمس بک ،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۵۴

۲۔ علی عباس ،جلال پوری ’’روایات تمدن قدیم‘‘ خردافروز ،جہلم ،۱۹۹۱ء،ص۱۸۴

۳۔ ول ڈیورانٹ ’’ہندوستان‘‘ تخلیقات ،لاہور،۱۹۹۵ء،ص۱۱۰

۴۔ لیوہیوبرمین ،یورپ امیر کیسے بنا (ترجمہ وتلخیص عبداللہ ملک) نگارشات ،لاہور،س ن،ص۲۱

۵۔ ایضاً ،ص۲۶

۶۔ مبارک علی ،ڈاکٹر ’’جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر‘‘،مشعل ،لاہور،۱۹۹۶ء،ص۳۴،۲۷

۷۔ سبط حسن ’’نوید فکر‘‘ دانیال ،کراچی ،۱۹۸۳ء،ص۳۰

۸۔ مبارک علی ،ڈاکٹر ’’جاگیرداری اور جاگیردارانہ کلچر‘‘ ،ص۲۳

۹۔ سبط حسن ’’پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء‘‘ دانیال ،کراچی ،۱۹۸۷ء،ص۲۷۶

۱۰۔ ول ڈیورانٹ ’’ہندوستان‘‘ ،ص۱۱۱

۱۱۔ مبشر حسن ’’شاہراہ انقلاب‘‘ ٹمپل روڈ ،لاہور،س ن،ص۱۲

۱۲۔ ول ڈیورانٹ ’’ہندوستان‘‘ ،ص۱۱۲

۱۳۔ جواہر لال ،نہرو ’’تلاشِ ہند‘‘ تخلیقات ،لاہور،۱۹۹۲ء،ص۲۷۰

۱۴۔ مبشر حسن ’’شاہراہ انقلاب‘‘ ،ص۱۰

۱۵۔ ول ڈیورانٹ ’’ہندوستان‘‘ ،ص۱۱۳

۱۶۔ سبط حسن ’’پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء‘‘ ،ص۲۸۲،۲۸۱

۱۷۔ ڈی ڈی ،کوسمبی ’’قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب۔تاریخی پس منظر میں‘‘ ،ص۳۱

۱۸۔ سبط حسن ’’پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء‘‘ ،ص۲۳۸

۱۹۔ جواہر لال ،نہرو ’’تلاشِ ہند‘‘ تخلیقات ،لاہور،۱۹۹۶ء،ص۳۲۱

۲۰۔ ماہِ نو ،سہ ماہی ،مطبوعاتِ پاکستان ،لاہور،۱۹مارچ ۱۹۸۸ء،ص۲۸

۲۱۔ لیوہیوبرمین ،یورپ امیر کیسے بنا ،ص۸۲

۲۲۔ مبشر حسن ’’شاہراہ انقلاب‘‘ ،ص۲۲

۲۳۔ علی عباس ،جلال پوری ’’روایات تمدن قدیم‘‘ ،ص۱۸۴

۲۴۔ لیوہیوبرمین ،یورپ امیر کیسے بنا ،ص۸۴

۲۵۔ ایضاً،۸۶
۲۶۔ مبشر حسن’’شاہراہ انقلاب‘‘۳۵،۳۴
۲۷۔ ایڈورڈ سعید،ثقافت اور سامراج (مترجم: یاسر جواد) مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد،۲۰۰۹ء،ص۲۲
۲۸۔ ایضاً،ص۲۵
۲۹۔ فرانز فینن ،افتادگان خاک (مترجمین: محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)، لاہور، نگارشات،۱۹۹۶ء،ص۳۳

❁……❁……❁